لیکچر سیریز : تصوّرِ علم اور تعلیم

پروفیسر حبیب الرحمٰن عاصم

لیکچر نمبر: ۹

تعلیم: ریاست کی ذمہ داری

علم اور تعلیم پر گفتگو کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاکستان اور پاکستان جیسے دیگر ممالک جو تعلیم کے میدان میں بہت سے مسائل سے دوچار ہیں ان میں اصلاح، بہتری اور سدھار کی کیفیت پیدا ہو سکے۔ اس ضمن میں بہت سے دانش وروں اور اہل علم نے اپنے اپنے تجربات اور علم کی بنیاد پر تعلیم کے شعبہ میں اصلاح کی کوششیں کی ہیں لیکن چونکہ تاریکی اس قدر زیادہ ہے کہ ایک آواز کو چند بار بلند کرنے سے معاملہ سدھر نہیں رہا جب تک کہ اس آواز میں بہت ساری آوازیں شامل نہ ہو جائیں۔ یعنی اجتماعی کوششیں ہی اس میدان میں درکار انقلاب کا سبب بن سکتی ہیں۔ تاہم اس حوالے سے یہ نہ سوچا جائے کہ ایک آدمی کی آواز تو نقارخانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوگی۔ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے انقلابات چند آدمیوں کی کوششوں سے شروع ہوئے۔ مثلاً انقلابِ فرانس، جو بعد میں صنعتی انقلاب اور ایجاد و اختراع کے دور کی بنیاد ثابت ہوا، کی بنیاد پیرس میں سوبورن یونیورسٹی کے ایک استاد اور چار پانچ طالب علموں نے رکھی اور بعد میں یہ انقلاب پورے یورپ میں پھیل گیا۔ بقول شاعر ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس لیکچر میں ہم تعلیم اور ریاست کی ذمہ داریوں کے بارے میں چند باتوں کا اعادہ کریں گے۔ یہ مشکل صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی ابھی تک پائی جاتی ہے کہ اصلاح کا عمل کہاں سے شروع ہو؟ ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ ہر فرد اگر سدھر جائے تو معاشرہ اور ملک خود بخود سدھر جائیں گے۔ اور ایک تعداد ایسی ہے جو اس کے بالکل برعکس خیال اور رائے رکھتی ہے یعنی یہ کہ جب تک نظام اور حکمران اور حکومت درست نہیں ہوگی اس وقت تک معاشرہ درست نہیں رہ سکتا۔ اور جس طرح بہت سارے دیگر میدانوں میں بھی کسی ایک رائے کو اختیار کر لینے کے بعد کسی دوسری رائے کی کلیتہً نفی کرنا ہمارا ایک مزاج بن چکا ہے اور جس کی وجہ سے بے شمار خرابیاں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ خود تعلیم اور ریاست کے حوالے سے بھی اسی طرح کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر فرد یعنی معلم اور طالب علم اپنے آپ کو درست کرنا شروع کر دے تو ایک وقت آئے گا کہ پورا معاشرہ درست ہو جائے گا۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال اس کے برعکس ہے۔

اس گفتگو میں ہم دونوں افکار کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افغانستان کی سرزمین پر ایک مسلم فلسفی ثناء الغزنوی بڑے معروف ادیب گزرے ہیں۔ یہ اتنے بڑے ادیب ہیں کہ علامہ اقبال ان کی قبر پر حاضری دیتے ہیں اور ان کو نہ صرف سلام پیش کرتے ہیں بلکہ تمنا بھی کرتے ہیں کہ اُن کا وہ نور بصیرت اِن کو بھی میسر آ جائے۔ ثناء الغزنوی نے اپنے ایک ادبی فن پارے میں یہ بات لکھی ہے کہ ''انسان ایک ایسا شجر ہے جس کی جڑ اوپر اور شاخیں نیچے کی طرف جاتی ہیں''۔ اس کی تفصیل میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن انسان اگر غور کرے تو بالکل یہی صورتِ حال بدن کے اعتبار سے دکھائی دیتی ہے کہ جس طرح درختوں کی جڑیں زمین کی طرف اور شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ایک چلتا پھرتا شجر کہ جس میں ایک درخت کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں انسان کی شکل میں اس کو زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت دی اور اس کا ڈھانچہ اسی انداز میں بنایا گیا ہے کہ اس کا سر اس کی تمام شاخوں اور پتوں، پھلوں اور پھولوں کو آگے بڑھانے

اور پنپنے اور خوبصورت بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، جس کا ایک نتیجہ انسان کا بدن ہے۔ انسانی معاشرے کی کیفیت بھی کچھ اسی انداز کی ہے کہ وہ معاشرہ اوپر سے رہنمائی حاصل کرتا ہے جس کی بنیاد پر اس میں نظم وضبط پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر درخت پر غور کیا جائے تو اس میں کمال صرف جڑوں اور بنیاد کا نہیں ہوتا بلکہ ایک وقت آتا ہے کہ اس میں جیسے ہی شاخیں نمودار ہوتی ہیں تو پھر شاخیں جڑوں کو توانائی عطا کرتی ہیں۔ اور جڑیں شاخوں کو برگ وبار لانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ شاخیں آکسیجن حاصل کرتی ہیں۔ روشنی حاصل کرتی ہیں اور بیرونی فضا سے اپنے اندر قوت جمع کرتی ہیں اور جڑیں اندر کی طرف سے شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں کو توانائی منتقل کرتی ہیں۔ اور بالآخر یہ عمل ترقی اور بہتری کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔

معاشرے پر اگر ایک اور انداز سے غور کیا جائے تو یہ بات بھی بالکل واضح نظر آتی ہے کہ ریاست ایک دل کی طرح ہے۔ جو افراد سے ان کی خواہشات، ان کے افکار اور خیالات وصول کرتا ہے۔ انہیں صاف ستھرا کرتا ہے۔ انہیں نکھارتا ہے پھر ایک منظم طریقے سے پورے جسم میں پھیلا دیتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے جس کی بناء پر جسد انسانی میں سب سے زیادہ اہمیت دل کو عطا کی گئی ہے۔ اور اس میں بھی اگر غور کیا جائے تو دونوں کا کردار ایک دوسرے کے ساتھ تعاون والا ہوتا ہے۔ اگر کبھی جسم اچھی غذا، بہت ساری آلائشوں سمیت بھی دل کو مہیا کرے گا تو دل کے اندر اتنی طاقت ہے جو اسے صاف کرسکتی ہے۔ اور اس میں اسے نکھار کر صاف شفاف خون پورے جسم میں منتقل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اور اگر انسانی جسم دل کو مسلسل غلط غذا اور غلط خیالات منتقل کرتا رہے تو دل بھی بالآخر اس کا شکار ہو جاتا ہے اور پورا بدن اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس اعتبار سے ریاست کو اوپر سے نیچے کی طرف دیکھا جائے یا نیچے سے اوپر کی طرف، حکمرانوں سے آغاز کر لیں یا عوام سے اس میں بنیادی کردار تو حکومت ہی کا ہے۔ جو دراصل حکمران، مشیر، وزراء اور متعلقہ ادارے ہیں جو ہمارے ملک میں یا کسی بھی ملک میں پائے جاتے ہیں۔ عوام اپنی خواہشات، مطالبات، افکار اور خیالات حکومت کی طرف اور حکومت اپنے فیصلے اور منصوبے عوام کی طرف منتقل کرتی رہتی ہے۔ اور جب ہم اپنے ملک پر غور کرتے ہیں تو یقیناً اس اہم پہلو کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک ایسی ریاست ہے جس کے دستور میں اس کا اسلامی اور جمہوری ہونا، اور اس کا ایک اسلامی اور فلاحی ریاست ہونا لکھ دیا گیا ہے۔ جس میں تعین کر دیا گیا ہے کہ یہ ریاست کس انداز کی ہوگی اور کس انداز میں ترقی پاسکتی ہے۔ اس وجہ سے اس ریاست کی اخلاقی ترقی اور مادی ترقی نے یقیناً ایک ساتھ آگے بڑھنا ہے اور اس میں تعلیم ایک بنیادی کردار ادا کرے گی۔ اس وجہ سے ریاست کے تمام اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دستورِ پاکستان کی بقاء اس کے تحفظ اور دفاع کے لیے اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔ یہ وہ جملے ہیں جو ہم اکثر سنتے بھی رہتے ہیں پڑھتے بھی رہتے ہیں اس لیے کہ جب دستور بن جاتا ہے تو اس میں اس کا تعین ہو جاتا ہے کہ منزل کیا ہے۔ منزل کا تعین ہو جانے کے بعد پھر راستے متعین کیے جاتے ہیں اور پھر قافلے اس راستے کی طرف چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اِس دستور کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ انسانوں کی فکری، روحانی، بدنی ضرورتوں کو نہ صرف پورا کرتی ہے بلکہ اس کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جو تعلیم جو انسان کی صرف بدنی ضرورتوں کو پورا کرے، مقاصد کے لحاظ سے ادھوری رہتی ہے اور وہ تعلیم جو بدنی ضرورتوں کو یکسر نظر انداز کردے وہ بھی ادھوری ہوتی ہے۔ اس لیے کہ انسان کی فکر اور اس کی روحانی کیفیتیں، اس کے جذبات اور اس کی تمام معاشی اور بدنی ضرورتیں تعلیم کے مقاصد میں شامل ہیں۔ اس وجہ سے جب بھی ہم ریاست کی بات کرتے ہیں اور ریاست کے ساتھ تعلیم کو منسلک کرتے ہیں تو ریاست سب سے پہلے اپنے مقصدِ وجود کو متعین کرنے کے بعد پھر تعلیم کے مقاصد کے حوالے سے اپنے مقاصد کا تعین کرتی ہے اور نہ صرف اس کا اعلان کرتی ہے بلکہ ہر ایک ادارے کو اس کا پابند بھی بناتی ہے۔ تبھی جا کر وہ ایک ریاست بنتی ہے۔ اگر کسی ریاست میں کوئی بھی ادارہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرنا شروع کردے تو پھر یقیناً یہ مثالی کیفیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ

وہاں پر حکومت و ریاست اپنا کردار درست طور پر ادا کر رہی ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسے تمام حالات کو طوائف الملوکی اور انتشار کی کیفیت کہا جاتا ہے۔ اگر یوں ہونے لگے کہ جس کے دل میں جو بات آئے وہ کر گزرے اور جو ادارہ جس طرح کی چاہیے پالیسیاں بنائے اور انہیں نافذ بھی کر دے تو اس طریقے سے ریاست قائم رہ سکتی ہے اور نہ ہی عوام کسی خاص راستے پر چل کر اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے ریاست کا کام یہ ہے کہ نہ صرف وہ اپنے مقاصد کا تعین کرے بلکہ تعین کے بعد وہ اداروں کو اس کا پابند بنائے اور اس پر پوری نظر رکھے۔

تعلیم میں بھی ریاستی فیصلے اسی بنیاد پر ہونے چاہییں ۔۔۔۔۔ جب آپ ریاست کی بات کرتے ہیں تو جو دستور ریاست میں طے کیا جا چکا ہے جس پر وہاں کے دانش وروں، علماء، مفکرین اور اہل علم نے اتفاق کر لیا ہے تو اس دستور کی مطابقت سے تعلیمی نظام آگے بڑھنا چاہیے۔ وہاں کے علماء اور دانش وروں نے تعلیم کے بارے میں جو کچھ کہا، جو کچھ سوچا، تجربات کی بنیاد پر جن چیزوں کا فیصلہ کیا، ریاست کو چاہیے کہ ان دانش وروں اور علماء کی بات کو نظر انداز نہ کرے، اس کی طرف توجہ دے۔ ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی جمہوری روایات کے مطابق کسی بھی فیصلے سے پہلے سیر حاصل بحث کرے، اور پھر دلائل کی قوت کی بنیاد پر اس فیصلے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے اور اس میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے بہت سارے ممالک میں جس میں پاکستان بھی شامل ہے، تعلیم، دفاع، معیشت اور دیگر بہت سارے میدانوں میں جب بھی فیصلے ہوتے ہیں تو اس میں اس ملک کے دانشور، اساتذہ، اور اس کے سوچنے سمجھنے والے افراد کی بہت کم تعداد شریک ہوتی ہے۔ اصولی طور پر کسی بھی پالیسی کو اس وقت تک منظور نہ کیا جائے جب تک کہ قوم کا ہر طبقہ خصوصاً اس شعبے سے براہ راست منسلک افراد اس پر کھلی بحث کر کے اپنی سفارشات نہ پیش کر دیں۔ یہ طریقہ غلط ہے کہ تعلیمی پالیسی کے مختلف اجزا پر مشتمل ابواب مخصوص لوگ اپنے ایر کنڈیشنڈ کمروں میں تصنیف فرما کر مسلط کر دیں۔ کسی ایک فرد یا چند افراد کا خیال پورے ملک پر نافذ اور اسے مسلط کرنے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے جس کی بناء پر ہر آنے والے گروہ نے سابقہ گروہ کے فیصلوں کو یا تو کالعدم قرار دے دیا یا پھر اس کو اس قدر تبدیل کر دیا کہ اس کا حلیہ بگڑ گیا اور اس کی صورت ہی مسخ ہو کر رہ گئی۔ اس لیے تعلیم کے حوالے سے جب بھی ریاست کو کچھ فیصلے کرنا ہوں تو اس میں چند افراد کی رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلے نہیں کرنے چاہییں بلکہ وسیع مشاورت ہونی چاہیے۔ ملک کے دانشور، اساتذہ، اہل علم، سوچنے سمجھنے والے افراد کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہو، اعتراض کرنے کا پورا حق اور پورا وقت دیا جائے۔ اور پھر ساری طویل گفتگو کے بعد جہاں کوئی نتائج مرتب ہوتے ہوں تو نتائج کی بنیاد پر تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا جائے۔ تبھی وہ ملک بھی کامیاب ہوگا، حکومت کے فیصلے بھی کامیاب ہوں گے اور عوام بھی خوش دلی کے ساتھ اسے قبول کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ اس لیے ریاست کا کام نہ صرف فیصلے کرنا بلکہ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان فیصلوں کی بنیاد پر اداروں کو دیکھنا، افراد کو دیکھنا، مختلف تنظیموں کو دیکھنا اور ایک نگرانی اور احتساب کا عمل مسلسل کرتے رہنا یہ اس کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غور و فکر سے کام لیا جائے تو کسی بھی میدان میں جہاں بھی مشکل نظر آئے گی فوراً اس کا سبب بھی پتہ چل جائے گا۔ جب ریاست آنکھیں بند کر لے اور مقتدر اپنی من مانی کرنا شروع کر دیں اور ہر ایک ادارے کو بے لگام آزادی دے دی جائے تو وہاں انتشار اور فساد کی کیفیت یقیناً سامنے آ جاتی ہے۔ تعلیم کا رُخ، نصاب کا تعین، اساتذہ کی ملازمت اور ترقی کے ضابطے، تعلیمی بجٹ کی تفصیلات وغیرہ طے کرنا اور ان پر عمل درآمد کرانا ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اب اگر اپنے ملک پر نظر دوڑائیں تو عملی طور یہاں کئی نظام چل رہے ہیں اور اگر ان تمام نظاموں پر غور کریں گے تو بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ ملک میں کوئی نظام نہیں چل رہا۔ تعلیم کے شعبہ میں ریاست ایک بھرپور کردار ادا کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ مسئلہ صرف پاکستان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں دیگر بہت سے مسلم ممالک کا بھی یہی حال ہے۔ تاہم اپنی گفتگو کو اپنے ملک کے تناظر میں محدود کرتے ہوئے ہم مختصر جائزہ لیں تو ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم سرکاری اداروں میں ناقص اور پرائیویٹ (نجی) اداروں میں اس قدر مہنگی ہے کہ صرف دولت مند اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلا سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک

صاحبِ اختیار ٹولہ تعلیم کو مخصوص حلقوں تک محدود کرنا چاہتا ہے تاکہ چند محدود اور مخصوص خانوادے علم حاصل کر کے حکومت کی مشینری کو چلانے کا اجارہ حاصل کر لیں۔ چنانچہ یہاں غیر ملکی اداروں اور غیر پاکستانی خودمختار اداروں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور پاکستانی سرکاری ادارے بھی موجود ہیں۔ پھر پاکستانی پرائیویٹ ادارے بھی کام کر رہے ہیں اور ان کی بھی کئی قسمیں ہیں- چند ادارے ایسے ہیں جن کی طرف تمام تر سہولتوں کا سیلاب امڈتا چلا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی مراعات دینی ہوں تو سب سے پہلے وہی ۱۰/۱۵ ادارے ہیں جو سامنے آ جاتے ہیں۔ بجٹ، اساتذہ، کتابیں، سہولتیں، ترقی، ہر چیز میں وہی چند ادارے اس ملک سے سب کچھ لینے کی طلب میں اور کوشش میں رہتے ہیں۔ اور اگر اس وقت ایک اور نظر سے دیکھیں تو ہمیں ایک تصویر دکھائی دیتی ہے کہ طبقاتی نظام کو ہم نے ترجیح دے رکھی ہے اور ایسا طبقاتی نظام جس میں مختلف افراد سماجی اور طبقاتی اعتبار سے بھی اور نظریات کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے خلاف اور ایک دوسرے کو کم تر سمجھنے والے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بااختیار افراد کی طرف سے طبقاتی نظام تعلیم کو متعارف کرا کے پاکستان کی یکجہتی کے خلاف باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ اور ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت اور اقتدار ایک خاص طبقے سے نکلنے نہ پائے۔ ایک مثال توجہ طلب ہے کہ محترم جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں اسلام آباد کے چوٹی کے اداروں (اسلام آباد ماڈل اداروں) کو بزور اُردو میڈیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس وقت سرکاری اور عوامی اشرافیہ کے بچے ان اداروں میں پڑھتے تھے۔ اسی دوران بیکن ہاؤس، سٹی اسکول اور فرابل انٹرنیشنل جیسے انگریزی میڈیم ادارے برساتی مینڈکوں کی طرح ابھرے اور آج ان کا اجارہ ہے اور اتنی فیسیں لی جاتی ہیں کہ عام آدمی کے بس کا روگ نہیں کہ ان اداروں میں اپنے بچے پڑھا سکے۔ اہمیت انگریزی کی نہیں بلکہ اس بات کی ہے کہ فوجی اداروں، مقابلے کے امتحانوں اور دیگر مراحل پر انتخاب کے لیے امتحانات انگریزی میں ہوتے ہیں لہٰذا ان بچوں کو ہر صورت میں فوقیت حاصل رہتی ہے جنہوں نے انگریزی میڈیم اداروں سے پڑھا ہوتا ہے۔ یہ بھی اقربا پروری کی ایک قسم ہے۔

گروہی تعلیمی نظام بھی موجود ہے۔ مذہبی طبقے میں دیکھا جائے تو بہت بڑی تعداد جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچ چکی ہے اس میں بھی فرقہ وارانہ تقسیم کی بنیاد پر ان اداروں کو پروان چڑھایا جاتا ہے اور اس کی ترقی کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مذہب بھی اپنے مکمل تصور کے ساتھ ملک میں کوئی مفید کردار ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ اس لیے کہ اس کو بھی مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حکمران طبقہ چند اداروں میں مسلسل پل رہا ہے، بن رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔ جس میں امیر، بیوروکریٹ، لینڈ لارڈز اور صنعت کار سب اپنے اپنے اداروں کا انتخاب کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو وہاں پڑھاتے ہیں اور ان کا مستقبل یہی ہوتا ہے کہ پہلے دن جب وہ کلاس میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ آئندہ ملک کی باگ ڈور آپ ہی نے سنبھالنی ہے۔ تعلیم کے میدان میں آپ جیسے بھی ہوں لیکن آپ اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لیں کہ بالآخر یہ ملک آپ ہی کے حوالے کیا جائے گا۔

عوامی بنیادوں پر جو بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں ذرا ان پر نظر دوڑائیں تو ان میں اکثریت ایسی ہے جیسے کولھو کا بیل اپنے ہی دائرے کے گرد گھومتا رہتا ہے اور مسلسل سفر کرتا ہے مگر فاصلہ طے نہیں کر پاتا اور گمان کرتا ہے کہ نہ جانے میں نے کتنی مسافتیں طے کر لی ہیں لیکن شام کو جب اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ وہیں پر کھڑا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ نہ کوئی قبلہ ہے نہ سمت ہے جس فرد اور ادارے کے ذہن میں جو بات آتی ہے وہ اُسی کو پڑھانا شروع کر دیتا ہے۔

تعلیم کو اگر دیکھیں تو یہ تصویر بھی بالکل واضح ہے کہ دین کے نام پر مذہبی اور فرقہ وارانہ تعلیم دی جا رہی ہے اور دنیا کے نام پر مادہ پرست اپنا الّو سیدھا کر رہے ہیں۔ یہاں لفظ مادہ پرست کا مطلب مادی ترقی میں کردار ادا کرنے والے نہیں، بلکہ دولت کی پوجا کرنے والے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں دولت کو ہر غلط اور ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کا جو رجحان بڑھتا نظر آتا ہے وہ یقیناً ہمارے نظام تعلیم کا ایک بُرا نتیجہ ہے۔ جب انسانوں کی روحانی رہنمائی کرنے والے افراد انہیں آپس میں لڑانے میں مصروف ہوں اور انسانوں کی بدنی

اور معاشی ضرورتوں کو مہیا کرنے والے افراد صرف چند افراد، چند خاندان، چند طبقات کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جائیں تو یہ یقیناً بہت غمناک صورت حال بن کر سامنے آتی ہے۔

جب اس حوالے سے آپ غور کریں گے تو یقیناً علامہ کا یہ پیغام اور درد جو انہوں نے اپنے ملک میں محسوس کیا (اگر چہ اس وقت اس کا نام پاکستان نہیں تھا، لیکن علاقہ یہی تھا نظام ایسے ہی چل رہے تھے۔ افراد اور ادارے کچھ اسی انداز سے کام کر رہے تھے، ملکوں کی صورتِ حال کچھ اس سے بہتر نہیں تھی) بڑے درد بھرے اندار میں انہوں نے یہ بات اپنے ایک فارسی شعر میں کہی کہ:

اگر محمدؐ کہ جن کی نگاہ ایسی تھی دیدارِ الٰہی کے باوجود بھی پلک نہیں جھپکنے والی وہ اگر واپس اپنی ہی قوم کی طرف پلٹ کر آجائیں اور اپنی قوم کی حالت دیکھیں اور دیکھنے کے بعد اچانک یہ کہہ دیں کہ یہ قوم میری اُمت نہیں ـــــ تو کیا بنے گا!

اگر ہمارے آقاؐ کی طرف سے آواز آجائے کہ تم مجھ سے نہیں تو یقیناً اس سے بڑی بد نصیبی کیا ہوسکتی ہے۔ علامہ نے یہ بات ہر حوالے سے کہی اور تعلیم کے میدان میں بھی ہمیں یہی صورت حال دکھائی دے رہی ہے کہ دین ہو یا آخرت کے معاملات ہوں سب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم لوگ انتشار کا شکار ہو چکے ہیں۔ معیار تعلیم پر غور کریں تو اس میں بھی اسی قسم کا انتشار اور مختلف قسم کی آراء اور مختلف قسم کی کیفیتیں دکھائی دیتی ہیں۔ غیر ملکی اداروں کا تعلیمی معیار مختلف مضامین کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اس میں پڑھنے والے نسبتاً بہتر مہارت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ نظریہ پاکستان سے بیگانے ہیں۔ سرکاری اداروں میں لوگ ایم اے تو کر لیتے ہیں لیکن ان میں صلاحیت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی البتہ فکری انتشار پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جب ملک میں انتشار ہوگا تو ہر اعتبار سے انتشار ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا۔ مراعات یافتہ اداروں میں معیار مناسب ہے لیکن اس میں طلبہ کو پہلے دن سے احساس برتری کا شکار بنایا جاتا ہے کہ تم ہی اس ملک کے وزیر اور سربراہ ہوگے اور تمام اداروں کو چلانا تمہارا کام ہوگا اس لیے تمہیں کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں معیار ملا جلا ہے لیکن پھر بھی اکثر ادارے بے قبلہ، بے سمت اور سرمایہ بنانے والے کارخانے ہیں۔ علامہ نے بھی شاید اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے:

> خود اپنی کھیتی کو اپنے ہی ہاتھوں سے ویران نہ کرو۔ دوسروں کے بادل سے بارش کی امید لگانا اور بارش کی بھیک مانگنا اچھی بات نہیں ہے''۔

زبان تو تمہاری ہے، لیکن اس میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ تمہاری نہیں ہوتی، وہ دوسروں سے لی ہوئی گفتگو ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد پر تم منصوبے بناتے ہو۔ اس کی بنیاد پر اپنے معاملات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہو۔ باہر کے لوگوں سے لیے ہوئے اصول وافکار اور خیالات کو اگر ویسا ہی اپنے ملک میں نافذ کر دیں تو یقیناً ایک خلفشار اور انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔ پاکستان میں اس وقت مجموعی صورت حال یہ ہے کہ ۵۳ فیصد اس وقت شرح خواندگی ہے اور اس میں یہ تلخ حقیقت موجود ہے کہ یہ ۵۳ فیصد مردوں اور خواتین کی مجموعی تعداد ہے۔ یعنی خواتین میں خواندگی کا تناسب اور بھی کم ہے۔ سندھ اپنے تعلیمی معیار یا کم از کم تعلیمی مقدار کے لحاظ سے تمام صوبوں کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن ابھی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جسے خواندہ یا نیم خواندہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اور ہمارے ہاں تو خواندہ کو بھی عجیب مخمصے میں ڈال دیا گیا ہے کہ جسے اپنا نام پڑھنا آتا ہو اسے بھی خواندہ میں شامل کرتے ہیں۔ اور اب تو یہ صورت حال ہے کہ ایک فرد بی-اے، ایم-اے کر لیتا ہے لیکن اسے اپنے دل کی بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا اور نہ وہ کوئی چیز تحریر کر سکتا ہے۔ بھلا ایسا فرد مستقبل کی منصوبہ بندی کیا کرے گا؟ یہ صورت حال قابل غور بھی ہے اور قابل افسوس بھی۔ ہم پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے ایک خاص ماحول میں رہتے ہوئے محسوس کرتے ہیں کہ ملک ترقی کر رہا ہے۔ ہم بہت کچھ حاصل کر رہے ہیں مگر ایسی ایسی باتیں اور داستانیں موجود ہیں کہ جن کو سنا جائے تو آدمی دنگ رہ جائے کہ اکیسویں صدی میں یہ بھی صورتِ حال ہوسکتی ہے۔ ۶۱ فیصد اسکولوں میں بجلی نہیں ہے اور ۹۷ فیصد

اسکولوں میں گیس نہیں ہے۔۳۴ فیصد اسکولوں میں پینے کا پانی موجود نہیں ہے۔۹۵ فیصد اسکولوں میں ٹیلی فون نہیں اور کچھ اسکول بلیک بورڈ اور کتابوں کے بغیر ہیں! جس بستی میں اسکول بلیک بورڈ اور کتابوں کے بغیر ہوں گے اس بستی کے لوگ سارے کے سارے مجرم ہوں گے۔ اس لیے کہ اس بستی کے لوگ یقیناً دن میں تین بار کھانا تو کھاتے ہوں گے۔لباس ضرور پہنتے ہوں گے۔دن رات گزارنے کے لیے کسی نہ کسی چھت کا بندوبست انہوں نے کیا ہوگا۔اگر ذرا سا بھی وہ اپنی ترجیحات کو صحیح طور پر استعمال کرتے تو چند کتابیں خریدنا، پانی کا بندوبست کرنا بہت مشکل بات نہیں تھی۔جب ریاست کی سطح پر عوام کے بنیادی مسائل سے بے اعتنائی برتی جائے تو عام افراد بھی بے نیازی کا رویہ اپنا لیتے ہیں۔اس بے نیازی بلکہ خود غرضی میں نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ خود پاکستان میں اسلام آباد شہر کی بستیوں میں اگر جانے کا موقع ملے تو پتہ چلے گا کسی گھر سے ایک بڑی گاڑی برآمد ہو رہی ہے جس کی قیمت پچیس تیس لاکھ ہوگی۔گھر کے بالکل سامنے جو گلی گزر رہی ہے اس میں گندی نالی ہے۔ادھر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر اور یہ تمام خرابی پائی جاتی ہے لیکن اسے اگر کوئی فکر ہے تو صرف اپنی گاڑی کی اور اپنے گھر میں آنے والے مال کی ہے۔اپنی گلی کے لیے وہ بالکل بیگانہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب رپورٹ ملتی ہے کہ بعض اسکولوں میں صاف پانی کی ٹینکی نہیں ہے، پینے کا پانی نہیں ملتا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہاں پانی میسر نہیں ہے۔اصل بات یہ ہے کہ انسان کا ذہن آہستہ آہستہ بالکل بے تعلق ہونا شروع ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ ہمیں کیا، اتنے سارے لوگ ہیں، ان کو اپنا بندوبست خود کرنا چاہیے۔ریاست کی کمزور گرفت کی بنیاد پر آہستہ آہستہ یہ بیماری عوام تک پہنچنا شروع ہو جاتی ہے اور ہر ایک صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور وہ اپنے محلے، گلی، ادارے کے بارے میں سوچنے سے بالکل اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے اور یہ سوچ اوپر سے یعنی حکمرانوں سے آتی ہے کیونکہ گروہی نفسیات کا یہ اصول ہے کہ لوگ غلط العام باتوں کو اپناتے یا حکمرانوں کے طے شدہ معیارات کی پیروی کرتے ہیں۔''الناس علی دین ملوکھم ''میں بھی یہی اصول بیان ہوا ہے اور اسی سے یہ سوچ بھی پیدا ہوتی ہے کہ حکمرانوں پر دوہری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ایک اپنا ذاتی کردار ادا کرنے کی اور دوسرے عوام کے لیے ایک مثبت نمونہ فراہم کرنے کی۔

کالجز کی صورت حال بھی بہت اچھی نہیں ہے۔ہائر ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے جو بجٹ متعین کیا جاتا ہے تو ۶۰۰ کالجوں کے لیے ۴۸۰ ملین روپے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔جو ایک کالج کے لیے آٹھ لاکھ روپیہ بنتا ہے جس سے صرف کیمیا کی تجربہ گاہ کے لیے کیمیکلز ہی آ سکتے ہیں۔اور ۳۰ یونیورسٹیاں ہیں جس میں ۲۵۲۵ ملین روپے کا اہتمام ہوگا۔اس میں بہت بڑا تفاوت نظر آئے گا۔اگرچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں یونیورسٹیوں میں تحقیق ہوتی ہے۔لیبارٹریز ہوتی ہیں، یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، اس لیے یونیورسٹی میں کالجوں کے مقابلے میں زیادہ فنڈ مہیا کیے جاتے ہیں۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ فنڈ بھی صرف یونیورسٹی کی مشینری کو چلانے میں صرف ہو جاتے ہیں اور ان میں سے تحقیق و تدقیق کے لیے کچھ باقی نہیں بچتا۔اگر آپ کالجز میں طلبہ و طالبات کی تعداد پر غور کریں گے اور یہ پہلو پیش نظر رکھیں کہ وہ ادارے جہاں یونیورسٹیوں کے لیے نرسری کی تیاری ہوتی ہے وہاں بھی لیبارٹریز کی ضرورت ہے، وہاں بھی کمروں اور اساتذہ کی ضرورت ہے، لیکن اتنا بڑا فرق ہونے کی بنیاد پر یقیناً کالجز کا حال تعلیمی اداروں میں سب سے زیادہ خراب ہے، حتیٰ کہ پرائمری اسکول کے مقابلے میں بھی کالجوں کی صورتِ حال زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔کالج یونیورسٹی کی نرسری ہوتے ہیں جس طرح اسکول کالج کی سطح کی تعلیم کے لیے نرسری کا کردار ادا کرتے ہیں۔جب کالج سے معیاری اور قابل طالب علم یونیورسٹیوں تک نہیں پہنچیں گے تو تحقیق و تدقیق کا معیار کیا ہوگا؟ اور یقیناً یہاں کی صورتِ حال ایسی ہے کہ اگر کچھ حقائق بیان کیے جائیں تو لوگ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے! لیکن ایسا ہو رہا ہے۔ایک تعلیمی پالیسی میں اعلان کر دیا گیا کہ پہلی سے لے کر آٹھویں تک کسی طالب علم کو فیل نہیں کیا جائے گا۔خواہ کوئی کتنا ہی نکما کیوں نہ ہو اور اُسے کچھ بھی نہ آتا ہو پھر بھی اسے مسلسل اگلی کلاس میں پروموٹ کرنے کا اہتمام کر دیا گیا۔ جب یہ کمزور نرسری آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی کالجوں میں پہنچ جائے گی اور وہاں تعلیمی معیار کی صورتِ حال مزید خراب ہوگی تو پھر یک لخت

زیادہ فیل ہونے والوں کی تعداد کالجوں میں نظر آئے گی۔ جامعات کی حالت زار اگرچہ نسبتاً بہتر ہے لیکن خرابیاں اور کمزوریاں یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک ہی پروگرام/ ڈسپلن کے مختلف قسم کے نام ہیں۔ نہ صرف نام مختلف ہیں بلکہ اس کے دورانیے بھی مختلف ہیں۔ ایک ہی ڈسپلن کی بیچلر ڈگری کہیں دو سال کی ہے اور کہیں چار سال کی۔ کہیں اس کا نام بی اے ہے، کہیں بی ایس سی اور کہیں بی ایس آنرز۔ جو طالب علم چار سال لگا کر بی ایس آنرز کر لیتا ہے، عملی زندگی میں وہ دو سال لگا کر بی ایس سی کرنے والے کے برابر ہی رکھا جاتا ہے۔

ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ طالب علم بی اے تک پہنچ کر بھی یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ ایم اے کس مضمون میں کرے گا۔ بی اے میں اسے دو یا تین ایسے مضامین کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جس سے اُس کے آئندہ تعلیمی ہدف کا تعین ہو جائے۔ لیکن پاکستان میں کالجوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جہاں مضامین کا مناسب کمبی نیشن آپ کو نہیں ملتا۔ بعض مضامین تو کسی خفیہ ایجنڈے کے تحت ختم ہی کر دیے گئے ہیں۔ انہی میں فارسی بھی ہے۔ عموماً لوگ سمجھتے ہیں کہ فارسی زبان غیر اہم ہے اس لیے کالجوں میں اس کے خاتمے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ایک تو یہ خاتمہ امریکہ کی خواہش کے عین مطابق ہے۔ دوسرے فارسی میں امت مسلمہ کا بہترین تحقیقی اور ثقافتی سرمایہ موجود ہے اور یوں فارسی کو ختم کر کے ہم جہاں کسی اور کے ایجنڈے کی تکمیل کر رہے ہیں وہاں اپنی آئندہ نسلوں کو اس عظیم علمی سرمائے سے محروم کرنے کے اجتماعی جرم کا بھی ارتکاب کر رہے ہیں جس کا متبادل تیار کرنے کے لیے صدیوں کی کاوش درکار ہوگی۔ طالب علم مجبوراً متضاد قسم کے دو مضامین اختیار کرتا ہے، چاہے تو ادب میں چلا جائے چاہے تو معیشت یا سیاست وغیرہ میں چلا جائے۔ بعض جگہ مطلوبہ مضامین کے انتخاب کی اجازت ہے لیکن فیکلٹی معیاری نہیں یا مضمون کو پرکشش نہ بنا سکنے کے باعث طلبہ اس مضمون میں رجسٹر ہی نہیں ہوتے۔ یونیورسٹیوں میں بھی اس وقت ایسی ہی پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ پاکستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں ۱۶ سال میں ایم اے کی ڈگری مل جاتی ہے اور چند ایک یونیورسٹیوں میں بی اے ۱۶ سال میں ہوتا ہے۔ اس فرق کی وجہ سے طلبہ بہت سے مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جامعات کے مختلف قسم کے پروگرام کرنے کا جب اہتمام کیا جاتا ہے تو اس میں ملکی ضرورت یا طلبہ کی ضرورت کو نہیں بلکہ اس ادارے کے چند افراد کی ضرورت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی ادارے کی بنیادی ضرورت اور کردار کو نظر انداز کر کے تعلیمی پروگرام بنا لیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں زرعی یونیورسٹیوں میں ایم بی اے اور بی بی اے اور کمپیوٹر سائنس کی تعلیم جب شروع کی جاتی ہے اور اس پر آواز اٹھتی ہے اور کافی سال تک یہ تعلیم چلتی رہتی ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ زرعی یونیورسٹی بنائی گئی ہے زراعت نے یہاں ترقی کرنی ہے، ایم بی اے کا اس میں کیا کام ہے یا کمپیوٹر سائنس کا کیا کام ہے؟ تو جواب میں ایک ہی بات آتی ہے کہ طلبہ جو آتے ہیں فیس دیتے ہیں تو اس سے ہم یونیورسٹی کے بجٹ کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس صورت حال سے شاید یونیورسٹی کو چند لاکھ روپے سالانہ تو مل سکتے ہیں مگر جس مقصد کے لیے یونیورسٹی قائم کی گئی تھی اس میں تحقیق کا بندوبست کرنے کے لیے ارتکاز توجہ میں بڑی رکاوٹ پڑتی ہے۔ بذات خود جب بحث حاصل کرنے کے لیے بعض مضامین کا آغاز کیا جائے تو اس سے یونیورسٹی کے قبلے اور سمت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

ملک میں اس وقت آئی ٹی اور بزنس کی تعلیم کا سیلاب ہے اس کو پروموٹ کرنے کے لیے ہر گلی میں بی اے اور ایم بی اے کی کلاسز اور کالجوں اور اداروں کا اہتمام ہو چکا ہے۔ نیچرل سائنسز افسردہ ہیں۔ آپ کسی بھی نیچرل سائنس کے استاد کے پاس جائیں تو پریشان ہو کر اپنی حالت زار بیان کریں گے۔ جہاں تک سوشل سائنس کا تعلق ہے تو وہ واقعی اپنی آخری سانسوں کی کیفیت میں ہے۔ بے شمار تعلیمی اداروں میں دیکھا گیا ہے کہ سوشل سائنسز میں طلبہ آتے ہی نہیں ہیں۔ مختلف طریقوں سے انہیں بلانے اور اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن طلبہ ان کی طرف آتے ہی نہیں۔ اس کے اسباب بھی بہت سے ہیں اور بہت ساری مشکلات ہیں لیکن کیا کیا جائے؟ کیا ان مشکلات پر گریہ زاری کی جائے؟ یقیناً یہ کوئی حل نہیں ہے۔ علاج یہی ہے کہ صاف نیت سے عزم کیا جائے اور عملی اقدام اٹھانے کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ بچار کی جائے۔ علامہ نے یہ بات کہی تھی

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گذاف

اگر اخلاص نہیں ہے تو محض تقریر، تحریر، ادارے، سیمینار اور منصوبے کچھ نہیں کرتے۔ یہ رپورٹیں اور منصوبے پڑے رہ جاتے ہیں ان پر گرد و غبار پڑ جاتا ہے اور آنے والے ایک نیا منصوبہ بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بے شمار تحقیقات جو سرکاری سرپرستی میں ہوئی ہیں ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی خوش نصیب تحقیق ہوگی جسے فالو اپ میسر آیا ہوگا ورنہ وہ سب سرکاری دفاتر کی الماریوں میں دفن ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُسی موضوع کے اگلے مرحلے کے لیے بھی ان کو بنیاد بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اسی لیے ہمارے ہاں عملِ تحقیق ایک جمود اور ٹھہراؤ کا شکار ہے، جو قطعی طور غیر سائنسی رجحان ہے۔ کیونکہ سائنسی رجحان میں ہر دفعہ نئے سرے سے پہیہ ایجاد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور تحقیقات شائع کر دی جاتی ہیں تاکہ آئندہ تحقیقات اس سے آگے بڑھیں اور نئے نتائج انسان تک لائیں۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

افراد کی ایسی غلطیاں جن کے بُرے اثرات صرف غلط کار افراد پر پڑیں انہیں قدرت معاف کر دیتی ہے مگر جن کا نتیجہ انسانیت کے خلاف ہو ان کی معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یعنی افراد کی بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی سزا افراد بھگتتے ہیں مگر بعض غلطیوں کی سزا قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔

فرد کی غلطی کو فطرت معاف کر دیتی ہے لیکن اگر ملت یا ملک و ریاست اپنی ذمہ داری کو صحیح طریقے پر ادا نہ کرے تو فطرت ایسی قوموں یا ریاستوں کو معاف نہیں کیا کرتی کیونکہ افراد کی ذمہ داری محدود ذمہ داری ہے، اُن کی غلطی کا اثر صرف ان کی ذات یا چند ایک افراد تک ہوگا لیکن ایک ریاست کی ذمہ داری کہیں بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک مثال سے یوں سمجھ لیجیے جیسے کسی کا دل خراب ہو جائے، یا کسی کا دماغ گھوم جائے تو وہ سارے کا سارا فرد، اس کا پورا جسم متاثر ہو جائے گا اور پھر اس کا معمول کے مطابق جینا مشکل ہو جائے گا۔

ایسے میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا کیا جائے؟ بہت سے اربابِ فکر نے اس پہلو کو اپنی کتابوں اور تحریروں میں بیان کیا ہے۔ ہمیں دوبارہ اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہوگا۔ اگر ارادہ کر لیا جائے اور کام کرنا چاہیں تو کوئی مشکل نہیں ہے مگر آنکھیں بند کر لینے سے اپنی دنیا میں مگن رہنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات موجود ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں سینیٹ کی کمیٹی کی رپورٹ مرتب کی گئی پروفیسر خورشید احمد نے اسے مرتب کیا۔ تمام باریک باتوں کو اس میں جمع کیا گیا ہے۔ چار اسلامی تعلیمی کانفرنسوں کی سفارشات موجود ہیں اسی طرح اور بہت سی بہترین رہنمائی کی دستاویزات ہمارے پاس موجود ہیں۔ ریاست اگر اپنا مستقبل بہتر کرنا چاہے تو راہِ عمل کی تلاش میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ ریاست کو اپنے اہداف کا تعین واضح طور پر کرنا چاہیے کہ اس کا نظام حب الوطنی پر مبنی ہونا چاہیے۔ معاشرے کی روحانی، فکری ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیے۔ سب کے لیے یکساں تعلیمی سہولت ہونا یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اس پر جتنا بھی غور کیا جائے کم ہے اور صرف غور سے کیا ہوگا، فی الفور عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جب تک یکساں تعلیمی معیار اور سہولتیں میسر نہیں کی جائیں گی، جوہر قابل ضائع ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ کسی کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ کس گدڑی میں کون سا لعل چھپا ہوا ہے۔ اگر اسے آگے نکلنے اور بڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے تو وہ بڑے بڑے دانش وروں سے آگے بڑھ سکتا ہے لیکن اگر کوئی موقع نہ ملے، چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی جائیں تو یقیناً راستہ نہ پاتے ہوئے وہ وہیں ختم ہو کر رہ جائے گا۔ کتنا بڑا ظلم ہوگا

جب ہم کچھ ناکارہ افراد کے مستقبل کے لیے ایسے گوہر ہائے ناسفتہ کو ضائع ہونے دیں جن کو قدرت نے قیادتِ امتِ مسلمہ کی صلاحیتیں عطا کر کے اس دنیا میں بھیجا ہو۔ اس کی ساری صلاحیتیں وہیں دم توڑ جائیں گی۔

معیاری تعلیم دینے والا ایک نظام ہونا چاہیے، ایسا تعلیمی نظام جو افراد کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے والا ہو۔ جب تک اس کے بارے میں غور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک یقیناً کوئی مثبت تبدیلی سامنے نہیں آئے گی۔

ہمارے ہاں تعلیمی اسناد تو تقسیم کی جاتی ہیں لیکن ایک تخلیقی صلاحیت افراد میں اور ملک و ریاست کے سسٹم میں نہیں آ رہی۔ کوئی شخص اپنی ذاتی کوششوں کی بنیاد پر آگے بڑھا ہے تو یہ ریاست یا نظام کا کمال نہیں ہے، نہ معاشرے کا کمال ہے۔ پاکستان کے قیام کے لمحے سے لے کر آج تک ملک کے نابغہ افراد کے لیے ان کی علمی اور نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے والا نظامِ تعلیم مہیا نہیں کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیتوں کے وہ گوشے جو تخلیق و تحقیق اور قیادت و رہنمائی کے لیے درکار ہوتے ہیں اور جن کی بنیادیں نابغہ بچوں میں موجود ہوتی ہیں، پرداخت اور نشوونما سے ہمکنار نہیں ہو پاتیں اور وہ صلاحیتیں اور وہ نابغہ افراد ضائع ہو جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ نابغہ افراد کا وجود کسی معاشی گروہ، رنگ و نسل یا خطے سے مخصوص نہیں ہوتا۔ تاریخ کے اکثر عظیم لوگ معمولی گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے جب تک دنیا کو سنبھالنا ہے اسے اس کے موقع فراہم کرتا رہے گا۔ جب نظام بن جاتا ہے تو اس میں بہت سارے افراد کو مواقع ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب تک تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے والا نظامِ تعلیم وجود میں نہیں آتا یہ صورتِ حال یقیناً اسی طرح رہے گی۔

اس لیے جو بہت ساری سفارشات پیش کی گئیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں کہ قومی سطح پر عام سالانہ بجٹ کے ساتھ الگ سے تعلیم کے لیے ایک بجٹ کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ نہ صرف بجٹ کا اعلان اور اس کے اعداد و شمار بیان کیے جائیں بلکہ اس کا صحیح تعین بھی کہ کس صوبے کو، کس ادارے کو، کس میدان میں، کتنا بجٹ چاہیے۔ اور پھر اس بجٹ کا صحیح استعمال ترجیحات کی روشنی میں یقینی بنایا جائے۔ ریاست کی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ نگرانی کرے کہ کتنا بجٹ بنایا گیا اور کتنا استعمال ہوا اور کیسے ہوا۔ ملکی ضرورت کے تناظر میں ملکی وسائل کے ساتھ جب تک اس کو اختیار نہیں کیا جائے گا اس وقت تک صورتِ حال بہتر نہیں ہو سکتی۔ حکومت کی اپنی رپورٹ میں خود وزارتِ تعلیم نے بیان کیا ہے کہ فیڈرل سطح پر جو بجٹ مقرر کیا گیا تھا اس کا ۵۰ فیصد بھی خرچ نہیں ہو سکا۔ اس کے بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں جب کسی شعبے کا متعینہ بجٹ اس خاص مدت میں پوری طرح استعمال نہیں ہوتا تو اگلے سال اس بجٹ کو کم کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ مزید خسارے میں جانا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کیوں صحیح استعمال نہیں ہوا؟ یا اس کا صحیح تعین کیوں نہیں ہوا؟ یہ سب باتیں اور وجوہات ریاست کو دیکھنی چاہییں اور جو افراد اس کوتاہی کے ذمہ دار ہیں انہیں سزا دی جائے تاکہ آئندہ دولت اور وقت کے ضیاع سے بچا جا سکے۔

فیس کے معاملے میں ایک عجیب عدم توازن پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک شور ملک میں بپا ہے کہ ہم نے میٹرک تک تعلیم مفت کر دی ہے۔ کیا مفت کر دینے سے بات بن جاتی ہے۔ ہمارے ہاں سرکاری کالجوں میں بھی معمولی فیس لی جاتی ہے۔ ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ وہ افراد جو تعلیم کے اس نظام کو آگے بڑھانے میں مناسب کردار ادا کر سکتے ہوں ان سے وہ فیس ضرور وصول کرنی چاہیے۔ مہذب معاشروں میں وہ افراد بھی تعلیمی ٹیکس ادا کرتے ہیں جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی اور اگر ان سے پوچھا جائے کہ جب آپ کے کوئی اولاد نہیں تو آپ کس لیے تعلیمی ٹیکس دیتے ہیں تو وہ کہتے ہیں "اس لیے کہ قوم کے سب بچے میرے بچے ہیں"۔ بالکل مفت کر دینے کی بنا پر لاکھوں طلبہ جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں ان کی طرف سے آنے والی فیس سے حکومت محروم ہو جاتی ہے اور وہ افراد جو فیس ادا کر سکتے ہیں اپنے بچوں کو مہنگے انگریزی میڈیم پرائیویٹ اسکول میں لے جاتے ہیں اور یوں سرکاری تعلیمی اداروں کا ماحول ٹیلنٹ کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو جاتا ہے اور ایک متوازی نظام وجود میں آتا ہے جو باقی ماندہ افراد کو مزید احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جب یہی طلبہ یونیورسٹی میں پہنچتے ہیں تو وہاں اچانک فیس ایک دیو کی صورت میں ان کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر وہ ایک بڑی مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہلے فیس

نہ دینے کی بنیاد پر طلبہ میں لگن ویسی نہیں رہتی دوسری طرف حکومت ایک بڑی مالی مشکل میں مبتلا رہتی ہے اور پھر اعلیٰ تعلیم کی سطح پر ایک بہت بڑی فیس کی صورت میں انسان مشکل کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ دونوں صورتیں غور وفکر اور تبدیلی کی متقاضی ہیں۔ مفت تعلیم حاصل کرنے والا بے قدرا ہوجاتا ہے اور یہ بات بھی یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ بھاری فیس لگا کر جو شخص ڈاکٹر بنے گا اور اس سے کہا جائے کہ وہ خدمت خلق کرے تو اس کے سامنے بہت سارے سوالیہ نشانات آجائیں گے کہ پہلے تو تیس لاکھ ہم نے واپس لینے ہیں جو میں نے اور میرے والدین نے خرچ کیے پھر اس کے بعد خدمت خلق کے بارے میں سوچا جائے گا اور جب وہ یہ تیس لاکھ وصول کر لیتا ہے تو وصولی کا ایسا عادی ہوجاتا ہے کہ اس کو چھوڑنا اس کے بس میں نہیں رہتا۔

گورنمنٹ سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں کی مدد سے تعلیم میں ترقی ہونی چاہیے۔ قومی سطح پر ہم نے کئی تجربے کیے۔ ایک سوچ یہ تھی کہ تعلیم میں گورنمنٹ سیکٹر کو تمام ادارے اپنے کنٹرول میں لے لینے چاہییں اور پرائیویٹ سیکٹر کو کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہیے اور پھر اس کے برعکس بھی ہوا کہ مکمل طور پر آزادی دے دی گئی۔ یہ دونوں آراء اور اقدامات یقیناً افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ دونوں کو باہم مل کر متعاون ہوکر اس سلسلے کو آگے بڑھانا چاہیے لیکن ریاست کی مکمل نگرانی کو یقینی بنانا بھی لازمی ہے۔

دینی مدارس کو بھی ملکی نظام تعلیم کا حصہ بنایا جانا ازحد ضروری ہے۔ دینی مدارس کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے کہ وہ ادارہ بحیثیت ادارہ کام نہیں کر رہا ہوتا بلکہ کسی فرد کی ذاتی دکان یا، ذاتی ملکیت کی حیثیت سے کام کر رہا ہوتا ہے۔ ایک فرد جو کچھ چاہے وہ اپنے تعلیمی ادارے میں کر سکتا ہے۔ اس کے اگرچہ کچھ بورڈز بن چکے ہیں لیکن جب تک اس کو حکومتی ریاستی نظام کے دھارے میں نہیں لایا جائے گا اس وقت تک ایسے اداروں کی یہ تعداد اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مسلسل پریشانی بڑھتی چلی جائے گی۔ اس لیے دینی مدارس کو آہستہ آہستہ ملکی نظام کا حصہ بنانا اور نظام تعلیم میں اسے اس طریقے سے شامل کرنا کہ وہ اپنے آپ کو الگ نہ سمجھیں، اور ہم بھی انہیں اپنے آپ سے الگ نہ سمجھیں، بہت ضروری ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں طلبہ انتہائی ہونہار طلبہ موجود ہیں۔ وہ طالب علم جو صرف نو ماہ میں پورا قرآن مجید حفظ کر سکتا ہے اس کی قوت حفظ اور ذہنی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح طور پر ایک نظام تعلیم میں شامل کر لیا جائے تو وہ کتنے بڑے انقلابات برپا کر سکتا ہے۔ ایسی بہت بڑی تعداد دینی مدارس میں موجود ہے لیکن آہستہ آہستہ چار دیواری کے اندر رہتے رہتے ان کا ذہن ایسا بن جاتا ہے کہ جیسے کسی کے سر پر بچپن میں فولاد کی ٹوپی چڑھا دی جائے تو چاہے وہ اپنے جسم اور قد کاٹھ کے حساب سے بڑا ہوجائے گا لیکن فکری اعتبار سے وہ چھوٹا ہی رہے گا۔ اس لیے دینی مدارس کو بھی ملکی نظام کا حصہ بنا لینا چاہیے۔

ہمارے ہاں مشکل یہ بھی ہے کہ ریاست میں ذریعہ تعلیم کس زبان کو بنانا چاہیے، مشکل مسلسل بڑھتی جارہی ہے اس لیے کہ مشکل حل کرنے والوں کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کوئی نیت نہیں ہے اور اس عدم نیت کی دلیل یہ ہے کہ وہ صاحب اختیار وثروت ہونے کے باعث اپنے بچوں کو اعلیٰ تر انگریزی بلکہ غیر ملکی اداروں میں تعلیم دلوا کر انہیں عام بچوں پر ایک مستحکم برتری دلا کر گویا اسے یقینی بنا لیتے ہیں کہ انہی کے بچے ہمیشہ مقابلے کا امتحان (جو ہمیشہ انگریزی زبان میں ہوتا ہے) پاس کر کے حکمران طبقے میں شامل ہوں اور ایک محدود طبقے کی عوام پر حکومت کا سلسلہ یونہی بلا روک ٹوک جاری رہے۔ جیسے کہ کالا باغ ڈیم ایک لفظ ہے کہ جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی ہے تو کالا باغ ڈیم ایک بہت بڑی مشکل، سکیم اور مسئلے کے طور پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس طرح زبان بھی ہمارے لیے کھڑی کر دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں ہے لیکن اردو کو پاکستان کی قومی زبان اس لیے بھی ہونا چاہیے کہ یہ کسی ایک صوبے کی زبان نہیں بلکہ سارے صوبوں کی زبان ہے۔ یہ رابطے اور ایک دوسرے سے ملنے ملانے کی زبان ہے۔ اور سب سے زیادہ جس زبان میں پڑھنے والے افراد ہیں، سب سے زیادہ جس زبان کو بولنے والے افراد ہیں وہ اُردو زبان ہی ہے۔ یہ علمی زبان بھی ہے اور مقتدرہ قومی زبان کی کئی رپورٹوں میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی بھی مضمون ایسا نہیں ہے کہ جو اردو زبان میں نہ پڑھایا جاسکتا ہو۔ سائنس کا مضمون ہو یا کسی بھی

میدان سے تعلق رکھنے والا مضمون ہو اردو زبان میں اسے پڑھایا جاسکتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جو دوسرے کی زبان سے علمی ترقی حاصل کر رہا ہو۔ ایک بہت بڑی تعداد پاکستان میں ایسی ہے جسے صحیح طور پر ابھی اردو بھی نہیں آ رہی تو انگریزی ذریعہ تعلیم علم کے پھیلاؤ میں یقیناً ایک دیوار بنی رہے گی۔ ہمیں قومی زبان، انگریزی زبان، مقامی زبانیں اور بین الاقوامی زبانیں سب کا خیال رکھنا ہے۔ ریاست جب کسی علاقے میں بنتی ہے تو دستور اس کی رہنمائی کرتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ یعنی آئین قوم کے راستے اور منزل کا تعین کرتا ہے۔ دستورِ پاکستان کی دفعہ ۲۵۱ کی شق نمبر ایک میں کہا گیا ہے کہ "پاکستان کی قومی زبان اردو ہے، یوم آغاز سے پندرہ برس کے اندر اندر اس کو سرکاری اور دیگر اغراض کے لیے استعمال کرنے کے اقدامات کیے جائیں گے"۔ اور اسی کی دوسری شق میں کہا گیا ہے "انگریزی زبان اس وقت تک سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جاسکے گی جب تک اس کے اردو سے تبدیل کرنے کے انتظامات نہ ہو جائیں"۔

لیکن کیا تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان کی تدریس کو ختم کر دینا چاہیے؟ یقیناً یہ بالکل غلط بات ہے۔ اردو کے مقابلے میں انگریزی کو ختم کرنا یا انگریزی کے مقابلے میں اردو کو ختم کرنا دونوں اسی افراط و تفریط کا شکار ہیں جس طرح دینی مدارس اور دوسرا نظام تعلیم موجود ہے۔ اردو رابطے کی زبان ہے اور اسے ذریعہ تعلیم بنانا چاہیے اور آہستہ آہستہ اس کو ترقی دینی چاہیے۔ انگریزی بین الاقوامی اور علمی زبان ہے اور اسے ثانوی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ بے شمار میدانوں میں اس کا سیکھنا لازمی ہے۔ عربی زبان بین الاقوامی زبان ہے۔ دینی ضروریات کو پورا کرتی ہے اور بہت بڑی معاشی ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے۔

اگر دنیا کے جغرافیے پر نظر دوڑائیں تو پاکستان کا عرب دنیا سے تعلق جس قدر عربی کی بنیاد پر گہرا ہو سکتا ہے اور جس کی بنیاد پر پاکستان کی معیشت ترقی کر سکتی ہے کوئی دوسری زبان نہیں ہے۔ اگر پاکستان کی حدود سے باہر نکل کر دیکھیں تو آپ کو انگریزی زبان چھپتی ہوئی نظر آئے گی۔ چین میں چلے جائیں تو یہ زبان وہاں آپ کو نہیں ملے گی۔ روس میں چلے جائیں وہاں پر بھی نہیں ملے گی۔ ایران اور ترکی چلے جائیں وہاں پر بھی انگریزی زبان نہیں ہے۔ انگریزی زبان سے براہ راست ملکی رابطہ قائم کرنے کے لیے آپ کو سمندر پار جانا پڑے گا اور ایک سمندر نہیں کئی سمندر پار جانا پڑے گا۔ معیشت سے وابستہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس ملک میں آپ کو اتنی لمبی مسافت کے بعد اپنا مال پہنچانا پڑے اس کے مقابلے میں جغرافیائی لحاظ سے قریب ممالک جن سے زمینی رابطہ آسانی سے ہموار ہو سکتا ہے اُن کو معیشت میں زیادہ اہمیت ملنی چاہیے۔ اس میں انسان زیادہ آگے بڑھ سکتا ہے اور عربی زبان کے بارے میں ایک جملہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان تو معلوم نہیں کہ آئندہ سو سال تک رہتی بھی ہے یا نہیں، فرانسیسی زبان نہ جانے رہتی ہے یا نہیں، دو سو سال پہلے بھی یہ نہیں تھی، لیکن عربی زبان ڈھائی ہزار سال پہلے بھی تھی، اور قیامت تک رہے گی۔ یہ نہ صرف ہمارا ایمان ہے بلکہ گزشتہ ڈھائی ہزار سال اس کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ جب تک اس زمین پر اللہ کی کتاب موجود ہے عربی زبان موجود رہے گی۔ جب تک عربی زبان موجود رہے گی تب تک عربی بولنے والے بڑی تعداد میں موجود رہیں گے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے علاقوں کو کیسے خزانوں سے نوازا ہوا ہے اس کی رپورٹس پڑھ کر دیکھیں تو انسان کی عقل حیرت میں گم ہو جاتی ہے۔ پٹرول کنوئیں سب سے زیادہ، سونے کی کانیں اور ہیرے جواہرات سب سے زیادہ یہاں پائے جاتے ہیں۔ مگر انتہائی دکھ کا مقام یہ بھی ہے کہ اس دولت سے زیادہ تر "اغیار" ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کے ذریعے امت مسلمہ کی سائنسی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عرب اور مسلم دنیا کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہی۔ مسلمان قومیں صرف مصنوعات خرید رہی ہیں ٹیکنالوجی نہیں۔ اور مصنوعات تو کچھ عرصے کے بعد از کار رفتہ (obsolete) ہو جاتی ہیں! رقبے کے لحاظ سے دنیا کا مرکزی اور بہت بڑا حصہ ان کے پاس ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے عربی زبان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تعلیم کے ابتدائی آٹھ سال زبانوں کے سکھانے میں صرف کرنے چاہییں اور نفسیات دان اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ بچے کو اگر

صحیح طریقے سے زبانیں سکھانے کا اہتمام کیا جائے تو ایک بچہ بیک وقت تین زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ اور پاکستان میں ایسی مثالیں موجود ہیں جس میں ایک بچے نے بیک وقت پانچ زبانیں سیکھیں اور اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی لیکن اصل مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ صرف زبانیں سکھا دی جائیں بلکہ اور بھی بہت سارے مسائل ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں ہوگا اور نا معلوم وجوہات سے یہ مرحلہ آج اتنے برس گزرنے کے باوجود نہیں آ پایا۔

مقابلے کے امتحان میں بھی اردو کو علمی زبان کے طور پر استعمال کرنے کی سہولت اور اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ سہولت اور اہمیت ان دونوں الفاظ پر غور کرنا لازم ہے کہ جب تک یہ بات نہیں ہوگی بات نہیں بنے گی۔ زبان کو سکھانے کے لیے قواعد اور ترجمے کا پرانا طریقہ چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کرنے چاہییں اور انہی طریقوں سے نظام تعلیم بھی بنانا چاہیے۔ زبانوں کی تعلیم کے لیے سمعی و بصری وسائل خاص طور پر ٹی وی، کمپیوٹر اور لینگویج لیبارٹری وغیرہ کا کثرت سے استعمال ہونا چاہیے۔ دنیا بھر کے لوگ اس کو استعمال کر رہے ہیں اور پاکستان میں بھی انگریزی تعلیمی اداروں نے اس کو اختیار کیا اور پہلے کے مقابلے میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بی اے کرنے کے بعد بھی پاکستان کے طلبہ انگریزی میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن اب چھٹی ساتویں میں زیادہ سے زیادہ نویں دسویں میں جب بچے اس انگریزی سسٹم سے نکل کر آتے ہیں تو وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ اچھی انگریزی زبان پڑھ سکتے ہیں بول سکتے ہیں، انگریزی اخبارات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

غیر ملکی نصاب کو استعمال کرنے پر مکمل پابندی لگ جانی چاہیے اس لیے کہ یہ نصاب، اساتذہ اور طلبہ کو ذہنی طور پر محدود کر دیتا ہے ایک راستے کی طرف چلنے کے لیے۔ نئی نسل کو اپنی اقدار و روایات سے بے گانہ کر دیتا ہے۔ غیر اقوام کی مرعوبیت پیدا کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرعوبیت کی ایک بہترین مثال ہے۔ ہم ترقی یافتہ یورپ اور امریکہ کی طرح ہونا چاہتے ہیں اور ان کے نصاب کے ساتھ وہ قباحتیں بھی سمیٹ لاتے ہیں جن سے وہ نام نہاد ترقی یافتہ قومیں خود عاجز آ چکی ہیں اور ہماری فوقیت ختم کرنے کے لیے چاہتی ہیں کہ ہم بھی ان ہی کی طرح ان خرابیوں سے دوچار ہو جائیں۔ ملکی نصاب کو معیار کے اعتبار سے جونیئر کیمبرج اور سینئر کیمبرج کے مطابق بنانا چاہیے اور کیمبرج سے یقیناً ہمیں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ پاکستان میں اگر ان کتابوں کو ری ڈیزائن کیا جائے گا اور اس ضمن میں پاکستانی تہذیب اور ثقافت کو ملحوظ رکھا جائے تو پاکستان کی تعلیمی ضروریات بطریق احسن پوری کی جا سکیں گی۔

ریاست کو جہاں تعلیم، فنی تربیت اور دیگر امور کے لیے مالی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے، وہاں استاد کے انتخاب پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ کالجوں میں اساتذہ کی تقرری کے لیے محض ان کی ڈگری اور پانچ سات منٹ کے انٹرویو کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ کیا یہ پانچ سات منٹ کا انٹرویو اس کی تمام صلاحیتیں دیکھنے کے لیے کافی ہے؟ اور انٹرویو بھی فی الحقیقت انٹرویو نہیں ہوتا۔ کیونکہ انٹرویو تو اصل میں انٹرنل ویو (internal view) ہوتا ہے جس کا مطلب ہے شخصیت کے اندر کا منظر، جبکہ ہمارے اکثر انٹرویو امیدوار کو ناک آؤٹ (knock-out) کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یعنی کوالیفکیشن ہی نہیں بلکہ تدریس کے لیے مناسب میلانِ طبع کی جانچ بھی ہونی چاہیے۔

مادی سہولت اور معیار کے مطابق تنخواہ میں مساوات ہونی چاہیے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں تنخواہوں کا غیر معمولی فرق کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ پاکستان میں بہت سے ایسے پرائیویٹ ادارے ہیں جو کسی بھی استاد کو، کسی بھی لمحے کہتے ہیں کہ آپ ہمارے پاس آ جائیں ہم آپ کو ایک لاکھ دیتے ہیں۔ ایک لاکھ کے لیے وہ اس طرف منتقل ہو جاتے ہیں وہاں سے دوسری آفر ملتی ہے کہ ہم آپ کو ڈیڑھ لاکھ دیتے ہیں۔ پھر استاد تیسرے ادارے میں اور پھر چوتھے ادارے میں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جہاں ایک استاد چند مہینے پہلے بیس پچیس ہزار یا چالیس پچاس ہزار لے رہا تھا جب وہ دوسرے ادارے میں جا کر ڈھائی لاکھ لیتا ہے تو اس ادارے میں موجود تمام اساتذہ اس پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی کوئی ذریعہ تلاش کرنا چاہیے کہ ہم بھی اپنے پچاس ہزار

کوڈھائی لاکھ میں بدل سکیں۔ یہ افراط وتفریط اس قدر زیادہ ہے جو بہت سی سماجی پیچیدگیوں اور برائیوں کا سبب بنتی ہے۔اس میں بھی ریاست کا بنیادی کردار ہے کہ وہ اس کو کنٹرول کرے۔اداروں کو پابند بنائے کہ اس سے کم تنخواہ نہیں ہونی چاہیے اور نہ اس سے زیادہ کی اجازت ہونی چاہیے۔

تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ استاد کو معاشرے کے مختلف اداروں میں بھی کردار ادا کرنا چاہیے۔استاد صرف اسکول کالج یا یونیورسٹی میں ایک کلاس کی حد تک محدود نہیں ہوتا، وہ معاشرے کا فرد ہے اور معاشرے کے مسائل میں اسے شریک ہونا چاہیے۔اس لیے پنچائیت، جرگہ، عدالت، تھانہ، کچہری میں بھی اساتذہ کو مشاورتی کمیٹیوں کا حصہ بناتے ہوئے سرکاری طور پر استاد کو نمائندگی دینے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔اگر استاد ان مصالحتی کمیٹیوں میں شامل ہو جائے تو پاکستان کے بہت سے گھر ٹوٹنے سے بچ سکتے ہیں۔بے شمار گروہ آپس کے جھگڑوں سے بچ سکتے ہیں کیونکہ استاد بہر حال استاد ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیت دے رکھی ہے اس کا صبر اس کی حکمت عملی اور دانائی یہ سب وہاں پر کام آتی ہے۔پارلیمنٹ اور سینیٹ میں بھی اساتذہ کی ایک مناسب تعداد میں مخصوص نشستیں ہونی چاہییں۔دنیا میں بعض ممالک ایسے ہیں جہاں ایسا ہوتا ہے۔سوڈان جیسا ملک جو پس ماندہ سمجھا جاتا ہے اور پاکستان کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے وہاں قومی اسمبلی اور سینیٹ میں اساتذہ کو بہت بڑی تعداد میں نشستیں دی جاتی ہیں اور ان اساتذہ کا انتخاب اساتذہ ہی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے سوڈان کی اسمبلی میں بعض اوقات پی ایچ ڈی ڈاکٹرز کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے جو ہمارے ہاں یونیورسٹیوں میں بھی نہیں ہوتی۔اور یقیناً جن لوگوں نے پی ایچ ڈی کیا ہے اور تعلیم کے اعلیٰ مراحل سے گزر چکے ہیں وہ جب بھی کوئی تجویز دیں گے تو محض اپنی پارٹی کے کہنے پر تجویز نہیں دیں گے بلکہ اس کے پیچھے ان کا علم، ان کا تجربہ ان کی فکر کام کرے گی اور جب سینیٹ میں اور قومی اداروں میں اساتذہ کی ایک معقول تعداد موجود ہوگی اور وہاں کی مشاورتی کمیٹیوں میں وہ افراد موجود ہوں گے اور وہاں پر کسی شق پر بحث کرنے کا موقع میسر آئے گا تو یقیناً بہتر نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔پارلیمنٹ کے ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی حکومت کی مشاورتی کمیٹیوں میں سینئر اساتذہ کو شامل ہونا چاہیے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اور سینیٹ کی سابقہ تمام سالوں کی کارکردگی دیکھیں جہاں کوئی اچھی رپورٹ نظر آئے گی اس کے پیچھے ماضی کا کوئی سینئر استاد، کوئی فرد جس کا علم وتعلم سے کوئی تعلق رہا ہے، اس کی بنیاد پر وہ رپورٹیں مرتب ہوئیں اور یوں وہ بہتر رپورٹیں سامنے آئیں۔اس وجہ سے اساتذہ کو ان تمام اداروں میں شریک کرنے کی ضرور کوشش ہونی چاہیے۔

[اعلیٰ تعلیم کا بااختیار ادارہ ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) ایک بامقصد اور انتہائی ضروری ادارہ ہے لیکن اسے غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ ملک کے مجموعی مفاد کو پیش نظر رکھنے والا، تمام مضامین کو اہمیت کے اعتبار سے دیکھنے والا ہونا چاہیے۔چند مہینے پہلے پاکستان کی یونیورسٹیوں کے بارے میں رپورٹ شائع ہوئی۔گریڈنگ کی گئی کہ کون سی یونیورسٹی سب سے بہتر ہے اور جب گریڈنگ ہوگئی تو بعض افراد اور اداروں نے گریڈنگ کے اس کام کا جائزہ لیا۔انہوں دیکھا کہ صرف سائنسی مضامین کی بنیاد پر پورے پاکستان کی یونیورسٹیوں کو دیکھا گیا اور اسی کی بنیاد پر ان کی گریڈنگ کر دی گئی۔سوشل سائنس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور ریسرچ پیپر میں بھی یہ دیکھا گیا کہ باہر کے علمی رسائل میں سائنس کے مضامین میں سب سے زیادہ کس یونیورسٹی کے اساتذہ اپنے مضامین چھپواتے ہیں۔تو یقیناً یہ معاملہ کو جامعیت کے ساتھ نہ دیکھنا ہے۔کسی ایک رُخ پر دیکھتے ہوئے کسی ایک یونیورسٹی کو سب سے بہتر بتا دینا انصاف نہیں ہے۔اور جب کوئی یونیورسٹی سب سے بہتر بتائی جاتی ہے تو بجٹ کی ساری سہولتیں بھی اس کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔مراعات بھی اسی کا رُخ کر لیتی ہیں۔چنانچہ HEC کو غیر جانبدار رہنا، تمام مضامین کو اہمیت دینا اور ملکی مفاد کے لیے مجموعی طور پر سوچنا یقیناً اس کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔

ترقی پذیر قومیں جب سائنسی اور فنی ترقی کو ہی خالص ترقی سمجھیں گی تو فطرتاً ان کی توجہ بنیادی سائنسوں پر مرکوز رہے گی لیکن social sciences کو نظر انداز کرنا بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔۱۹۹۸ء وہ سال ہے جب ٹوکیو کے ایک ابتدائی اسکول کے بچوں نے

اپنی استانیوں کو گولی ماردی تھی۔ اس حوالے سے بنکاک میں منعقدہ ایک سیمینار میں ایک جاپانی استاد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ’’یہ ہماری اُس غلطی کی سزا ہے جو آج (۱۹۹۸ء) سے کوئی نصف صدی قبل ہم نے کی تھی یعنی صنعتی ترقی کی دوڑ میں باقی تمام شعبہ ہائے علوم کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم industrial giant تو بن گئے مگر ہماری نسلیں بزرگوں کے احترام کی امین جاپانی تہذیب سے کوسوں دور چلی گئی ہیں۔

تعلیمی اُمور میں ریاستی ضروریات کی طرف رہنمائی بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ طلبہ، تعلیمی اداروں اور والدین کو ملکی ضروریات کے حوالے سے رہنمائی میسر آنی چاہیے۔ ہر میدان میں مطلوبہ تعداد اور مطلوبہ تعلیم کے مراکز کہاں ہیں اور کیسے ہیں، ان سب کی باقاعدہ رہنمائی ریاست کی طرف سے ملک کے طلبہ کو میسر آنی چاہیے۔ ہمارے ہاں یہ صورتِ حال موجود نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی تعداد کو پتہ ہی نہیں ہے کہ کس کس مضمون میں کہاں کہاں ادارے پائے جاتے ہیں اور ان اداروں میں داخلے کس بنیاد پر ہوتے ہیں۔ سہولتیں کیا ہیں اور طالب علم اس میں داخلہ کس طرح لے سکتے ہیں اور اس کے بعد مستقبل کے اعتبار سے کیا کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ عموماً ریاستیں اس کی طرف رہنمائی نہیں کر رہیں۔ تاہم وہ ریاستیں بھی ہیں جن کو ہم ترقی یافتہ کہتے ہیں جو اپنے ملک میں باقاعدہ بتاتی رہتی ہیں کہ مثلاً اس وقت اتنے ڈاکٹرز موجود ہیں، اتنوں کی ہمیں مزید ضرورت ہے۔ اتنے تعلیمی ادارے ہیں۔ یہاں یہاں سے تعلیم حاصل ہو سکتی ہے۔ تمام میدانوں میں باقاعدہ رپورٹس مرتب کی جاتی ہیں اور افراد کو رہنمائی دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایڈووژن (Eduvision.edu.pk) میں، میں نے بہت سی رپورٹوں کے ساتھ ایک رپورٹ پڑھی۔ اس رپورٹ کے مطابق انہوں نے آٹھ شہروں میں تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ سے پوچھا کہ آپ کس میدان میں جانا چاہتے ہیں؟ ان میں بی اے تک کے طلبہ بھی شامل تھے اور ان میں سے ۵۸ فیصد نے یہ کہا کہ ہمیں نہیں پتہ کہ ہم نے کس میدان میں جانا ہے۔ اگر ایف اے، بی اے کرنے کے بعد بھی یا اس درجے تک پہنچنے کے بعد بھی طالب علم اسی مخمصے میں ہو کہ اس نے کہاں جانا ہے اور یہ کہ اسے کس میدان کا انتخاب کرنا چاہیے تو یہ پورے تعلیمی نظام کی ناکامی کا بہت بڑا ثبوت ہے اور ریاست کا کنٹرول نہ ہونا یا اس کی طرف بہت بڑا اشارہ ہے۔

نظامِ امتحانات میں بھی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ گورنمنٹ اسکول میں مڈل تک کوئی فیل نہیں جبکہ سیکنڈری اور ہائیر سیکنڈری اسکول میں فیل ہونے والوں کی تعداد مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ امتحانی نظام میں طالب علم کی صلاحیتوں کا نہیں بلکہ اس کی یادداشت کا امتحان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ذہانت اور صلاحیت کے باوجود سہولیات کی عدم فراہمی کے باعث کم وسائل طلبہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ نہیں لے سکتے۔ دوسری طرف امیر لوگوں کے بچے ہر جگہ داخلہ لے سکتے ہیں۔ گویا اس طرح ان ذہین لیکن غریب طلبہ کے اعلیٰ حکومتی مناصب تک پہنچنے کے امکانات مسدود ہو جاتے ہیں اور یوں ہم نادانستہ یا دانستہ طور پر ایک مخصوص حکمران طبقہ پیدا کرنے میں مصروف ہیں جو جمہوری اقدار کے فروغ کی راہ کی بڑی اور واضح رکاوٹ ہے۔ ہمیں نظامِ امتحانات کو بھی بدلنا ہوگا جس کا فیصلہ ریاست ہی کر سکتی ہے۔ اب سرکاری سطح پر یہ سفارش سامنے آئی ہے کہ کسی پرائیویٹ ادارہ (مثلاً آغا خان فاؤنڈیشن) کو بھی طلبہ کا امتحان لینے اور سند جاری کرنے کا اختیار دے دیا جائے۔ اس میں بہت سے لوگوں نے اپنی آراء اور تحفظات کا اظہار کیا۔ ان آراء میں ایک نقطہ تو بہت واضح طور پر آ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ پاکستان کا نظامِ امتحان بالکل ناکام ہو چکا ہے اس لیے کسی ایسے ادارے کو یہ نظامِ امتحان سپرد کر دیا جائے جو اس میں خصوصی مہارت رکھتا ہو۔ اخبارات میں خبریں آئی ہیں کہ ایف ایس سی، میٹرک حتیٰ کہ نویں جماعت کے کیمسٹری اور فزکس وغیرہ کے پیپر کئی مرتبہ آؤٹ ہو گئے اور کئی مرتبہ طلبہ نے امتحانات کا بائیکاٹ کیا۔ یقیناً اس کے پیچھے کچھ افراد یا کچھ ادارے کام کر رہے ہوں گے کہ ایک بار اس نظام کو بالکل ناکارہ ثابت کر دیں تاکہ ان کی جگہ کوئی این جی او یا کوئی ملٹی نیشنل کمپنی آ کر اپنا قبضہ جما سکے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں مثلاً انجینئرنگ اور میڈیکل کالجوں میں داخلے کے امتحانات کا اجارہ بھی ایک مخصوص گروپ کے پاس ہے جس کی کوئی سرکاری

حیثیت نہیں۔ اس کلچر کے فروغ سے کم آمدنی والے افراد کے بچوں کی راہیں مزید مسدود ہوں گی۔

طلبہ کی ذہنی صلاحیت اور رجحان کا اندازہ اسکول کی سطح تک ہو جانا چاہیے۔ روس اور دیگر ممالک میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ جب اسکول میں داخل ہوتا ہے تو پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک اس کی ماہانہ، سالانہ اور ششماہی رپورٹس تیار کی جاتی ہیں جس میں اس کے حاصل کردہ نمبروں کے ساتھ ساتھ اس کے ذہنی رجحان کو بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ بچہ کس مضمون میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے اور کس میدان میں زیادہ اچھی کارکردگی دکھا سکتا ہے۔ جس تعلیمی ادارے یا نظام میں بچوں کو پہلے دن سے ہی دیکھا جانے لگے تو یقیناً اس کے اساتذہ، والدین، اس کا ادارہ اس بچہ کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے اور اگر اس طرح کا اہتمام نہیں ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ہمارے ہاں ہو رہا ہے، کہ ایک طالب علم میٹرک میں سائنس پڑھے گا، اس میں فیل ہو جانے کے بعد ایف اے میں معیشت، اقتصادیات اور سوکس پڑھے گا۔ اور اگر اس میں فیل ہو جائے تو سیاسیات میں چلا جائے گا۔ اس میں فیل ہونے کے بعد ایجوکیشن میں آ جائے گا۔ اس میں فیل ہونے کے بعد ممکن ہے وہ ادب میں چلا جائے۔ یہ صورتِ حال یقیناً ہمارے لیے بہت افسوس ناک ہے۔

سرکاری سطح پر ماہرین فن اور نئے منصوبے پیش کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کئی بار ٹی وی پر بتایا جاتا ہے کہ اس شخص نے یہ چیز ایجاد کی یا نیا منصوبہ پیش کیا لیکن اس کے بعد وہ چیز گم ہو جاتی ہے۔ ایسے افراد، اداروں اور منصوبوں کو دیکھنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس میں ناکامی کے نتیجے میں قوم بتدریج ان ذہنوں سے محروم ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اُسے ایسے معاملات کے لیے دوسروں کے رحم وکرم پر بھی رہنا پڑتا ہے۔

مخلوط تعلیمی نظام کس حد تک صحیح ہے؟ اس کی حدفاصل کی نشان دہی ایک مشکل کام ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں مخلوط تعلیمی نظام اس لیے غلط ہے کہ کہیں پر بھی مخلوط اجتماع ہو ہی نہیں سکتا اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مخلوط تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ آپ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک اس نظام کو آگے بڑھائیں اور اگر آپ دیگر اسلامی ملکوں میں چلے جائیں تو یہ مخلوط نظام وہاں اس قدر آگے بڑھ رہا ہے کہ وہاں یہ مخلوط نہیں بلکہ مختلط ہو گیا ہے یعنی سب کو ملا دیا گیا ہے۔ ایسے میں تعلیم باقی نہیں رہتی، باقی سب چیزیں باقی رہتی ہیں۔

اب مختلف ٹی وی چینل آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور یہ چند سال کے اندر اندر ہی آئے ہیں زیادہ تر تو یہ نیوز یا انٹرٹینمنٹ چینل ہیں، تاہم ان میں سے چند چینلز ایسے ہیں جو بعض بچوں کی تعلیم کے لیے مسلسل کام کر رہے ہیں لیکن یہ انتہائی کم تعداد میں ہیں، اور تمام ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر رہے۔ اگر صحیح طریقے سے کچھ چینلز تعلیم کے لیے مخصوص کر دیے جائیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ پاکستان اور پاکستان جیسی دیگر ریاستوں میں بھی بہت سارے مضامین ایسے ہیں جن کو پڑھانے والے اساتذہ وافر تعداد موجود نہیں ہوتے اور طلبہ کو ٹیوشن کا ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش رہتا ہے۔ یہ ٹی وی چینلز تعلیمی اعتبار سے اگر رہنمائی پیش کرتے رہیں، اور مضبط انداز میں مخصوص مضامین میں مرحلہ بہ مرحلہ ہر سطح کی تعلیم دینا شروع کر دیں تو بہت اچھے انداز میں اور سستے انداز میں تعلیم ہر گھر میں اور ہر مقام پر پہنچانے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ جب فضولیات معمولی خرچ پر ان چینلز کے ذریعے گھر گھر پہنچ رہی ہیں تو تعلیم پہنچانے میں کیا حرج ہے۔ تاہم یہ چونکہ کاروبار نہیں ہے، اس لیے حکومت کو سرپرستی کرنی ہوگی۔

میڈیا کو اس وقت آزادی دستیاب ہے مگر افسوس کہ ان کاموں میں ابھی تک میڈیا کو ''آزادی'' میسر نہیں آئی کہ تعلیم کے میدان میں قوم کو کس طرح آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ آپ ٹی وی کے تمام پروگراموں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ پاکستان میں اچھے اساتذہ کے یا، اچھے سائنس دانوں یا اچھے ڈاکٹرز کے کتنے انٹرویو نشر ہوئے ہیں اور دوسری طرف فلمی ستاروں کے کتنے انٹرویو نشر ہوئے ہیں۔ تو آپ کو ان میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ معمولی فرق ہوتا تو بڑی بات نہ تھی لیکن زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا کہ اساتذہ، فلاسفر، دانش ور ملک میں علم کی بنیاد پر اور علم کے میدان میں کام کرنے والے ٹی وی چینلز پر نظر ہی نہیں آتے۔ اور اگر کہیں یہ فرق کچھ کم نظر آتا ہے تو اُن اوقات

میں جب سب کی پلکیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہو چکی ہوتی ہیں اور سونے کے لیے بستر کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے ہوتے ہیں۔

تعلیم کو عالمی معیار کے مطابق بنانے اور برقرار رکھنے کے لیے ریاست کی مسلسل کوشش ضروری ہے۔ اور یہ عالمی معیار اس وجہ سے کہ اب ملک، ملک نہیں ہے بلکہ پوری دنیا ایک ملک ہے اور اس لیے پوری دنیا کے معیار کو دیکھنا پڑتا ہے۔ علامہ نے یہ بات یقیناً سوچ کر کہی تھی کہ ملکوں، قوموں بلکہ پوری دنیا میں جس طرح سے انقلابات برپا ہو رہے ہیں، وہ کوئی معمولی سی بات نہیں ہیں۔ بہت تیزی کے ساتھ بڑے بڑے انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

علامہ کا یہ جملہ ہر میدان میں صحیح ثابت ہو رہا ہے، چاہے کمپیوٹر سائنس میں چلے جائیں یا میڈیکل سائنس میں، علم نجوم میں چلے جائیں یا ادب کی دنیا میں۔ لیکن آخر میں حوصلے کی بات کرنا لازم ہے اور انتہائی ضروری ہے، بلکہ فرضِ عین ہے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے
آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

بشرطیکہ ہم سب مل کر کام کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆